بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِشارات

گذشتہ سال ماہ رجب کے ترجمان القرآن میں ہم نے ضبطِ ولادت کے فتنہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس فتنہ کی آبیاری بڑے ہی باطل اور گمراہ کن نظریات نے کی ہے اور ان کی تہ میں یہ غلط خیال کارفرما ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات معاذ اللہ بڑی بخیل اور بے رحم ہے۔ اُس نے ایک ایسی زمین پر نسلوں کے پیدا ہونے اور بڑھنے کا سامان کر دیا ہے جس میں ان نسلوں کو پالنے کے لیے کافی سامان نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آبادی اور وسائلِ رزق کو متناسب رکھنے کے لیے قحط اور بیماریاں پھوٹ پڑتی ہیں جنگ و جدال اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوتا ہے، مگر خالقِ کائنات دُور کھڑے انسانوں کی اس تباہی و بربادی کا تماشا بڑی شانِ بے نیازی سے دیکھتے ہیں اور اُن کو اپنی مخلوق کے مصائب پر قطعاً رحم نہیں آتا۔

اس سلسلہ میں ہم نے یہ گزارش بھی کی تھی کہ اس فکر کی تخلیق میں بہت سے عوامل شامل ہیں۔ انسانیت کے متعلق مایوس کُن اور تاریک تصوّرات نے اس نظریہ کو جنم دیا، الحاد و زندقہ نے اسے پروان چڑھایا، انسان کی ہوا و حرص نے اسے عروج شباب بخشا اور دولت کی ہمہ گیر پرستش اور اُس کے حصول کے لیے مجنونانہ جدوجہد نے اس میں تدریجاً رنگِ تکمیل بھرا۔ اس نظریہ کی بنیاد نظامِ مادہ کے سکون آفریں تصوّر پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسانیت کو قدرت کے جس قدر عطیات ملنے تھے وہ سب مل چکے ہیں۔ اور اب نوعِ انسانی کو ربِ کائنات سے رزق کے معاملہ میں کسی قسم کی توقع وابستہ نہ کرنی چاہیے۔ اگر وہ زندہ رہنے کی متمنی ہے تو اُس کی عملی شکل اس کے سوا اور کچھ ممکن نہیں کہ وہ افزائشِ نسل کو روکے تاکہ مادہ کی یہ محدود دنیا اُس کے بوجھ کی متحمل ہو سکے۔

اہلِ مغرب کا بعض دوسرے افکار و نظریات کی طرح اس معاملہ میں بھی موقف بڑا عجیب و غریب ہے۔

وہ بحیثیت اصول کائنات کے حرکت آفریں تصور کے قائل ہیں، صرف قائل ہی نہیں بلکہ اس کے پُرجوش مبلّغ اور داعی بھی ہیں۔ اسی اصول کی اساس پر انھوں نے اپنے سارے نظریات و تصورات کے محل تعمیر کیے ہیں۔ اسی طرزِ فکر کے تقاضوں کے پیشِ نظر انھوں نے صدیوں کے پرانے افکار و معتقدات کو جھٹلا دیا ہے۔ یہ اسی تصور کی کرشمہ سازی ہے کہ انھوں نے خدا، حشر و نشر، وحی و رسالت — الغرض وہ سارے بدیہی حقائق جن کو انسان ہزاروں سالوں سے مانتا چلا آ رہا تھا، اور جن کی وجہ سے اُسے روحانی تسکین اور قلبی اطمینان حاصل ہوتا تھا، بغیر کسی دلیل کے رد کر دیئے۔ اس اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد اُس کے لیے یہ سوچنا بھی ناممکن ہو گیا کہ اس کائنات میں کوئی اصول، کوئی ضابطۂ حیات اور کوئی قانونِ اخلاق ایسا بھی ہو سکتا ہے جس کی پابندی دنیا کے ہر عہد میں کی جا سکتی ہو۔ اس نظریہ کے حامیین کے نزدیک تاریخ ایک مسلسل ہلچل ایک ہمہ گیر اضطراب ہے جس کی ہر لہر نئی شان کے ساتھ ہر لمحہ ابھرتی رہتی ہے۔ زندگی انقلاب و تغیّر کا محض دوسرا نام ہے اور اس کی فطرت میں عدمِ تغیّر یا ثبات و قرار کا کوئی معمولی سے معمولی عنصر بھی شامل نہیں۔ اہل یورپ کے یہ نظریات و افکار اُن کے ہاں اس بنا پر مقبول نہیں ہوئے کہ یہ سب ثابت شدہ حقائق ہیں بلکہ ان کی اگر وہاں پرستش کی جا رہی ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ سارے تصورات اُن کی زندگی کے اساسی تصور یعنی کائنات کے حرکی (DYNAMIC) نظریہ سے ہم آہنگ ہیں، حالانکہ یہ تصور بذاتِ خود ایک مفروضہ ہے جو حجت و استدلال اور ثبوت کا اسی طرح محتاج ہے جس طرح کوئی دوسرا مفروضہ ہو سکتا۔ مگر اسے یورپ کی ذہنی اپج کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جس عقیدہ پر اُن کی پوری تہذیب کی عمارت کھڑی ہے، اُسی کو وہ قدرت کے عطیات کے معاملہ میں ماننے سے گریز کرتے ہیں اور مادہ کے متعلق اُس سکون آفریں تصور کے قائل ہیں جس کی نفی پر انہوں نے اپنے سارے افکار و نظریات تعمیر کیے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تاریخ افکار کا مؤرخ جب مستقبل قریب میں اس ذہنی بحران میں سے گزرنے کے بعد اطمینان اور سکون کی فضا میں مغربی نظریات کی دلچسپ داستان قلمبند کرنے بیٹھے گا تو وہ لازمی طور پر علم و فکر کے بعض دوسرے مضحکہ انگیز "عجائبات" اور "نوادر" میں اس "شاہکار" کو بھی شامل کریگا کہ تاریخ کے ایک روشن دور میں علماء و فضلاء

کا ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہوا جو ایک طرف تو اس بات کا دعویدار تھا کہ زندگی پیہم انقلاب اور جاودان تغیر ہے، اس میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جس میں ٹھہراؤ ہو اور اس وجہ سے یہاں کسی بات پر قطعیت اور حتمیت کا حکم نہیں لگایا جا سکتا، مگر اس کے ساتھ ساتھ وہی گروہ یہ بھی تسلیم کرتا تھا کہ اس دنیا میں مادی وسائل کی ایک مقدار بالکل مقرر اور معین ہے اور انسان جس نسبت سے اسے استعمال کرتا چلا جائیگا اسی تناسب سے قدرت کے یہ خزائن کم ہوتے رہیں گے اور انسانیت اپنی بقا کے لیے مجبور ہو گی کہ وہ افزائشِ نسل کو روک دے۔ پھر طرفہ یہ کہ یہی گروہ اپنے فکر و نظر کے بارے میں اس بات کا بھی مدعی ہوا کہ کسی نظامِ فکر کے مختلف اجزائے ترکیبی کا باہمی ربط و تطابق ہی اس کی صداقت کا واحد معیار ہے اور جس نظام میں یہ چیز موجود نہ ہو وہ سراسر باطل ہے۔ ممکن ہے آج ہمیں یورپ کا یہ فکری تضاد اچھی طرح نظر نہ آتا ہو، مگر عنقریب جب حالات ذرا معمول پر آئیں گے تو لوگ اس کو یقیناً بڑی شدت سے محسوس کریں گے۔

اگر آپ اصل صورتِ حال کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ مستقبل کے امکانات کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ علمِ الٰہی میں اگرچہ مستقبل معین ہے مگر فعلیت اور تخلیق کے لحاظ سے اس کا ایک ایک لمحہ باری باری حال کے مقام پر جلوہ گر ہوتا رہتا ہے۔ قانون بقائے مادہ سے مراد یہ نہیں کہ پہلے سے مستقبل کا نظامِ حوادث عملاً تشکیل پا چکا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے انسان کو ایک سوچنے والا ذہن اور ایک دلِ بیتاب اس لیے دیئے ہیں کہ وہ ایک طرف نئے نئے مقاصد کی تخلیق کرتا چلا جائے اور دوسری طرف ان مقاصد کی تکمیل کے لیے اس آب و گِل کی دنیا سے اسباب فراہم کرنے کے انتظامات کرے۔ انسان کو خداوند تعالیٰ نے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ عالمِ مادی کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالے، اس کے مفید پہلوؤں سے پورا پورا استفادہ کرے اور اس کے مضر اثرات سے اپنی حفاظت اور پاسبانی کرے۔ ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ باوجود تمام علمی و فکری ترقیوں کے انسان یہ محسوس کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ فطرت میں اس کے تصرف کی ایک حد ہے جس سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن وہ کونسی حد ہے

اس کا تعین کرنا ہمارے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ قریب قریب ناممکن ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں بعض دون ہمت انسانوں نے یہ کہا کہ اب انسان اُس آخری سرحد پر پہنچ چکا ہے جس کے بعد قدرت کے خزانوں سے مزید کچھ حاصل نہیں کیا جا سکتا اور اسی بنا پر انھوں نے انسانیت کے مستقبل کی نہایت ہی تاریک اور گھناؤنی تصویر پیش کی۔ انھوں نے نوعِ انسانی کو بڑے سنسنی خیز اعداد و شمار بتا کر خوفزدہ کرنا چاہا۔ لیکن بعد میں آنے والے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ ان لوگوں کے سارے اندازے بالکل غلط تھے۔ کیا مالتھس کے نظریہ آبادی کو تاریخ کے واضح حقائق نے جھٹلا نہیں دیا؟ کیا قانونِ تقلیلِ حاصل کی اثر آفرینی کو انسان کی قوتِ فکر و عمل نے بہت حد تک کم نہیں کر دیا؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان جب طاقت کے زعم میں آکر خدائی کے دعوے کرنے لگتا ہے تو عین اُس وقت قدرت اُس کے ان باطل دعووں پر مسکراتی ہوئی اُسے کوئی ایسی سزا مرور دیتی ہے جس سے اُس پر اپنی حقیقتِ حال واضح ہو جاتی اور اُسے اپنی بے بسی اور بے چارگی کا احساس ہونے لگے مگر دوسری طرف وہ جب عالمِ مادی کی حکمرانیوں سے گھبرا کر ہمت توڑ بیٹھتا ہے اور کائنات اور اس کے خالق کے متعلق نہایت ہی مایوس کن افکار اپنے دل و دماغ میں پالنے شروع کر دیتا ہے تو انسان کے اس غلط طرزِ عمل پر بھی فطرت خندہ زن ہو کر کچھ ایسے اسباب بالضرور پیدا کر دیتی ہے جن سے اُس پر اپنے اندازوں کی عدمِ صحت کا راز منکشف ہو جاتا ہے اور وہ سوچنے پر مجبور رہتا کہ کوئی علیم و خبیر ذات، کوئی طاقت و قوت کی مالک ہستی ایسی بھی ہے جو اس کائنات اور اس کے انتظام و انصرام کو ایک تدبیر اور نظم کے ساتھ چلا رہی ہے۔ جس کی حکمتیں اس کے منصوبوں پر حاوی ہیں، جس کے علم میں وہ سب امکانات موجود ہیں جو عالم میں تکمیل پذیر ہو سکتے ہیں۔

ہم اس بات کا تو دعویٰ نہیں کرتے کہ اہلِ یورپ نے اب ہستیٔ باری تعالیٰ کا اقرار کر لیا ہے لیکن ہم یہ بات بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ پچھلے چند سالوں کے واقعات نے اُن کے افکار میں ایک تلاطم پیدا کر دیا ہے۔ وہ سارے افکار و نظریات جن کو وہ کبھی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، جن پر اُن کا ایمان وحی اور الہام سے بھی زیادہ پختہ تھا اور جن کی بنیاد پر انھوں نے اپنی تہذیب کا قصر اٹھایا تھا، ان کے بارے میں

بھی وہ اب نظرثانی کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ ہر وہ انسان جس نے یورپ کے جدید رجحانات کا ایک سرسری سا جائزہ بھی لیا ہے وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے۔ ہمارے لیے فکر و نظر کی اس تبدیلی کی ساری تفصیلات کا ذکر کرنا تو مشکل ہے۔ ہم یہاں مالتھس کے نظریۂ آبادی کے صرف ایک پہلو کا تذکرہ کرتے ہیں۔

وہ لوگ جنہوں نے آبادی کے اس نظریہ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ سارا نظریہ قدرت کی بخیلی کے گمراہ کن تخیل پر قائم ہے۔ اس کی رُو سے قدرت کے ذرائع کی ایک مقدار معین اور مقرر ہے۔ انسان فطرت کے دیئے ہوئے ان عطیات سے جس قدر فائدہ اٹھائے گا، اسی نسبت سے ان میں کمی ہوتی رہے گی اور اس طرح انسانیت ناگزیر طور پر غربت اور افلاس کے خطرناک غاروں کی طرف بڑھتی چلی جائے گی یہ ہے مختصراً وہ تصور جو مالتھس اور اس کے مقلدین اس کائنات کے بارے میں سالہا سال سے پیش کر رہے ہیں اور جس کی وجہ سے یورپ میں فکر و نظر کی ایک ایسی مغموم فضا تیار ہو گئی ہے جس میں انسانیت پر ہر لحظہ بھوک افلاس، غربت اور بیماری کا خوف چھایا رہتا ہے اور اسی قسم کے خیالی بھوتوں سے خوفزدہ ہو کر وہ قتلِ اولاد جیسے انسانیت سوز فعل پر آمادہ ہو گئی ہے۔

اسے انسانیت کے حق میں ایک فالِ نیک کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اسی قسم کی تاریک فضا اور افسردہ ماحول میں پیدا ہونے کے بعد بھی کوئی شخص اپنے ذہنی توازن کو برقرار رکھے اور صورتِ حال کا جائزہ لینے میں کسی حد تک حقیقت پسندی کا ثبوت دے۔ اسی قسم کی ایک کوشش کا تذکرہ ہم ذیل میں کرتے ہیں۔

چند روز ہوئے پنجاب یونیورسٹی میں ملکوکیم کے فوراً بعد ایک معاشی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں جو مقالات پڑھے گئے اُن میں زیادہ تر انہیں خیالات و تصورات کو پیش کیا گیا، جنھیں یورپ میں قبولِ عام حاصل ہے۔ مگر انہیں مقالات میں ایک مقالہ ایسا بھی سُنا گیا جو کافی حد تک فکر انگیز تھا اور جس میں

پٹے ہوتے راستوں سے ہٹ کر ایک نئی راہ اختیار کرنے کی کوشش کی گئی تھی مقالہ نگار کوئی ملّا نہ تھے کہ ان کے خیالات پر "تاریک خیالی" کی چھاپ لگا کر ہمارے روشن خیال لوگ فوراً رد کر دیتے بلکہ اس کے مصنف یورپین تہذیب کے ایک گل سر سبد ہیں۔ اس لیے ہمارے تجدد پسند اصحاب کو جن کے نزدیک خوب و ناخوب کا معیار صرف مغرب ہے، ان خیالات کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ وہ مالتھس اور ریکارڈو کے نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یاس و قنوطیت کے یہ پراپیگنڈہ کرنے والے برسرِ حق نہیں۔ قدرتی ذرائع کے متعلق سوچنے کا ایک حقیقت پسندانہ انداز بھی ہے جس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ نوعِ انسانی کا معیارِ زیست مسلسل بڑھایا جا سکتا ہے۔ ذرائع موجود نہیں ہوتے بلکہ وہ بنتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم اس حقیقت کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ یہ انسان کا علم ہی ہے جو قدرت کے عطیات کو انسانیت کے استعمال کے قابل بناتا ہے۔ اور علم کوئی جامد چیز نہیں، بلکہ یہ ہر آن ترقی کرتا رہتا ہے"

"انسان قدرت کے ان ذرائع سے پچاس ہزار سال سے برابر فائدہ اٹھا رہا ہے۔ لیکن آج دنیا کی جس قدر آبادی ہے، نہ تو کبھی پہلے اتنی آبادی ہوئی تھی۔ اور نہ ہی اسے وہ معیارِ زیست میسر آیا تھا جو موجودہ دور کے لوگوں کو حاصل ہے۔ اگر ہم کلاسیکی معاشیین کی ہمنوائی میں یہ تسلیم کر لیں کہ زمین کے طبیعی خواص میں پچاس ہزار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوا تو اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسانیت آج تک صرف اپنے پیدائشی حق پر ہی گذر بسر کرتی رہی ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ آج کا انسان پانچ سو سال پہلے کے انسان کی بہ نسبت زیادہ وسائلِ رزق رکھتا ہے۔ اس کے علمی و صنعتی کمالات نے قدرت کے عطیات کو اس کے لیے مفید بنا دیا ہے۔ جس تناسب سے یہ ذرائع کم ہوتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ سرعت کے ساتھ انسان ان میں اضافہ کر لیتا ہے۔ پروفیسر زمرمان کے الفاظ میں علم ہی تمام ذرائع کی کلید ہے۔ آج کے انسان اور اس دور کے انسان کے درمیان جو جانوروں کا شکار کر کے اپنی گزر اوقات کرتا تھا، فرق صرف علم کا ہے۔ اسی کی وجہ سے انسان کو آرام و آسائش میسر ہوئی ہے ۔ ۔ ۔ ہنرمندی اور ذہانت، جو علم کی حقیقی اساس ہیں"

وہی دراصل سارے ذرائع کا سرچشمہ ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ذرائع کا تصور سراسر حرکت آفریں ہے اور اسے انسانی احتیاجات اور اُس کی صلاحیتوں سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

پھر ذرائع سے مراد وہ مادی اور محسوس اشیاء ہی نہیں جو قدرت نے ہمیں عطا کی ہیں۔ صحت، معاشرتی ہم آہنگی، صحیح اور عقلمندانہ فیصلے، علم، آزادی اور حرّیت بھی انہیں ذرائع میں شامل ہیں اور یہ چیزیں سونے چاندی، لوہے اور کوئلے سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ وہ اصل ذرائع ان سارے عناصر کے باہمی امتزاج ہی سے معرض وجود میں آتے ہیں۔

سخت نادان ہیں وہ لوگ جو ذرائع کو کسی گودام میں رکھے ہوئے خام مال کا محض ایک ڈھیر خیال کرتے ہیں۔ وہ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ جتنی جلدی ہم ان ذرائع سے استفادہ کریں گے، اتنی ہی سرعت کے ساتھ یہ ذرائع کم ہوتے چلے جائیں گے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ان کے یہ احساسات بالکل غلط ہیں۔ قدرت کے عطا کردہ مال و متاع کا وہ جہان جس میں اس نے سب سے پہلے آنکھ کھولی وہ ایک نہ تھا بلکہ ایک لمبے سلسلہ کی بالکل ابتدائی کڑی تھی۔ جب اُس نے فطرت کے ان عطیات سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرلی، تو وہ خود بخود اس قابل ہوگیا کہ اسی طرح کے دوسرے جہانوں کی تلاش کرے۔ وہ جوں جوں ان کو مسخر کرتا چلا گیا اس کے سامنے سے کائنات کے بہت سے اسرار و رموز کے پردے خود بخود ہٹتے چلے گئے۔ اُسے ہر منزل پر یہ احساس ہوا کہ سامانِ زیست جیسے آئے ہوئے بے شمار کرے ابھی ایسے بھی ہیں جن پر تالے پڑے ہوئے ہیں اور وہ سراپا انتظار ہیں کہ کوئی ذہین و فطین انسان آئے اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے انہیں وا کرے اور ان کی چھت کے نیچے جو کچھ موجود ہے اسے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود پر نچھاور کردے۔

یہ وسیع و عریض کائنات جس کی پہنائیوں کی کوئی حد نہیں، یہ ساری کی ساری اُن ذرائع کی ترجمان ہے جو انسان کو اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے خالقِ کائنات نے ودیعت کیے ہیں۔

ذرائع و وسائل کا یہ حرکت آفریں تصور ایشیا اور اسی طرح کے دوسرے پسماندہ علاقوں

ریاض ۲۱۶۱

(بقیہ اشارات)

کے لیے بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ صنعتی ترقی کا ہر قدم ذرائع میں اضافہ کا باعث بنتا ہے اور علم و فن ان کے استعمال سے خود بخود پھیلتے جاتے ہیں۔ جب پاکستان کا ہر شہری لکھنا اور پڑھنا سیکھ لے گا تو اس کے ذرائع لازمی طور پر بڑھ جائیں گے ہم درحقیقت اپنے مدرسوں اور کالجوں سے جتنے حساب داں، اعداد و شمار کے ماہرین، مؤرخ، معاشین، سیاستدان، علوم طبعیات وکیمیا کے رمز شناس اور علم الانسان کے جاننے والے پیدا کریں گے، اسی تناسب سے ہمارے ذرائع میں ترقی ہو گی۔

ایشیا کے سب سے پسماندہ ذرائع اس کے پس ماندہ لوگ ہیں۔ پاکستان کی سب سے بڑی ضرورت تعلیم ہے۔ اسی کے پھیلنے سے ذرائع و وسائل میں ترقی ہو گی۔ علم اپنے وسیع تر معنوں میں یہاں کے باشندوں کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ ملکی پیداوار بڑھا کر ایک اچھا معیارِ زیست حاصل کر سکیں۔ یہ عمل مختلف ممالک میں کئی صدیوں سے جاری ہے اس میں اضافہ اور ترقی کی گنجائش ہر وقت موجود رہتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جس وقت دنیا کی پانچ فیصد فاقہ مست آبادی

بھی آرام و آسائش کا ایک معقول معیار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی تو اُس وقت انسان اپنے فارغ اوقات میں جب مالتھس اور اُس کے اندھے مقلدین کے ان پریشان کن خیالات اور مایوس کن افکار پر غور کریں گے تو وہ ان احمقانہ تصورات کو یاد کر کے بے اختیار ہنس دیں گے۔

ممکن ہے وہ لوگ جو اس دنیا میں رضیت باللہ ربًا و بالاسلام دینًا و بمحمد نبیًا کا نظریہ رکھتے ہیں، اور اسی کے سہارے زندگی گزارنے میں پوری نوع انسانی کی فلاح دیکھتے ہیں، ان کے نزدیک ان طویل اقتباسات میں دلچسپی کی کوئی چیز نہ ہو۔ وہ جب بھی انہیں پڑھیں گے تو ان کا تاثر ان کے بارے میں صرف یہی ہوگا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا ایک غیر مسلم کی زبان سے اقرار اور اعتراف ہے۔ اور حقیقت میں ان اقتباسات کی حیثیت ہے بھی یہی۔ اس سے زیادہ انہیں کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ جو کچھ اللہ اور رسول نے فرما دیا ہے وہ سراسر حق ہے۔ اس کی صداقت غیر مسلم یا خود مسلمانوں کی تائید سے وابستہ نہیں۔ جو چیز خود ہی معیارِ حق ہو اس کی صحت کو خارجی حالات و واقعات سے پرکھا نہیں جاتا بلکہ اس کے برعکس دنیا کے ہر قول اور فعل کو اسی ایک معیار پر جانچ کر دیکھا جاتا ہے کہ اُس میں حق کے کتنے اجزاء شامل ہیں، اور باطل کی کتنی آمیزش ہے۔ ہم نے اقتباسات کو یہاں ایک دوسرے نقطۂ نظر سے درج کیا ہے۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ ہمارا روشن خیال تعلیم یافتہ طبقہ انہیں پڑھے اور پھر دیکھے کہ جن گمراہ کُن اور باطل افکار کی یہاں ضبطِ تولید یا عائلی منصوبہ بندی کے دلکش ناموں سے تبلیغ کی جا رہی ہے، اُن کی صحت سے تو خود اُن کے آئمہ مغرب بھی انکار کر چکے ہیں۔ اب اگر یہاں کے تجدد پسند حضرات ان باطل نظریات کو یہاں پھیلانا چاہتے ہیں تو یا وہ پرلے درجے کے بے وقوف اور کم علم ہیں یا وہ انتہائی درجے کے فریب کار اور چالاک ہیں۔ اگر یہ لوگ سب کچھ اپنی نافہمی کی بنا پر، یا جدید رجحانات سے عدم واقفیت کی بنا پر کر رہے ہیں تو یہ چیز بہت شرمناک ہے۔ ایک "روشن خیال" کے لیے قرآن سے ناواقف ہونا تو روشن خیالی کی سب سے بڑی دلیل ہے جس پر وہ فخر کا اظہار کر سکتا ہے، مگر اسے یہ بات کسی طرح بھی زیب نہیں دیتی

کہ یورپ کے افکار و نظریات کے بارے میں اُس کی معلومات تازہ نہ ہوں اور اہلِ مغرب جن نظریات کو باطل ٹھہرا چکے ہیں وہ انہیں مسلمان قوم کو قبول کرنے کا مشورہ دے۔

ہم اپنے ملک کے روشن خیال طبقہ کے بارے میں یہ سوءِ ظن تو نہیں رکھتے کہ اُسے ان چیزوں کا علم نہیں البتہ اُس کے طرزِ عمل کو دیکھ کر ہمیں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اُس کی نیتیں ٹھیک نہیں۔ آدمی نے خدا کو دیکھا تو نہیں لیکن اُس کی قدرت سے ہی اُسے پہچانتا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کے افکار و نظریات، ان کے احوال و افعال اور اُن کے طرزِ بود و ماند کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک آدمی آسانی سے یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ یہ حضرات خواہ اس کا زبان سے اقرار کریں یا نہ کریں، مگر دل سے ضرور اس بات کے متمنّی ہیں کہ پوری امت ربّ العزّت کی بندگی ترک کر کے اُن کی خدائی تسلیم کرے۔ یہ سارا ملک، اس کے تمام ذرائع و وسائل ان چند لوگوں کے لیے وقف کر دیئے جائیں۔ الغرض یہ ساری قوم ایک ایسی شکار گاہ بن جائے جس میں یہ لوگ جس طرح چاہیں شکار کریں، ان کی عیاشیوں اور بد معاشیوں پر، ان کی ہوس رانیوں اور لذت پرستیوں پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہ ہو۔ چنانچہ آئے دن کبھی آرٹ اور ادب کے نام پر، کبھی معاشرتی فلاح اور ضبطِ تولید کے نام پر، کبھی عائلی منصوبہ بندی اور معیارِ زیست کے نام پر جو فتنے اٹھائے جا رہے ہیں یہ سب وہ بہانے ہیں جن کی آڑ میں اس قوم کو ان چند لوگوں کے لیے شکار گاہ بنایا جا رہا ہے۔

ایک بات جس کے متعلق ذہن میں کئی بار سوال اُبھرتا ہے وہ یہ ہے کہ آخر یورپ میں ساری برائیاں تو نہیں، وہاں کچھ اچھائیاں بھی ہیں مگر یہاں کے متفرنجین بار بار برائیوں پر ہی کیوں لپکتے ہیں۔ یورپ کے بہت سے ایسے ممالک ہیں جن میں معاشرتی فلاح کے لیے بہت مفید اور کارآمد اسکیمیں جاری ہیں۔ وہاں اجتماعی عدل کے حصول کے لیے کئی ایک مؤثر تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ وہاں شخصی آزادی کی حفاظت اور پاسبانی کے لیے دستور و قانون میں تحفظات موجود ہیں۔ وہاں تعلیم و تعلّم کا ایک اچھا نظام رائج ہے۔ وہاں غریب اور پسے ہوئے طبقوں کو اٹھانے کے لیئے جدوجہد کی جا رہی ہے۔ وہاں جمہوریت اور جمہوری اقدار کا دلوں میں احترام ہے، اور

کوئی بڑے سے بڑا آدمی ان کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرتا وہاں لوگوں کا ایک سیاسی اخلاق اور کردار ہے اور اسی کے مطابق وہ اپنی اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں وہاں کے سربراہ کاروں کو اپنے وطن اور قوم سے محبت ہوتی ہے اور وہ اپنے ہم وطنوں میں اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ نہیں جماتے۔ وہ قوم کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ آخر ان ساری خوبیوں سے یکسر صرف نظر کرتے ہوئے ہمارے قائدین بار بار ان برائیوں کو ہی اپنانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں جن کے تلخ نتائج آج کسی ہوشمند آدمی سے پوشیدہ نہیں۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کا ابھی اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اس ملک میں قیصریت اور بادشاہت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ جس طرح پرانے وقتوں کے بگڑے ہوئے شہزادوں کے لیے سماج کے ایک طبقہ کو اخلاقی اور دینی اعتبار سے بگاڑ کر اسے ان کی ہوس پرستیوں اور عیش و عشرت کے لیے تیار کیا جاتا تھا اسی طرح اب پوری قوم کو بگاڑ کر ان چند لوگوں کے لیے عشرت کدہ بنا دیا جائے۔ یہاں انہیں کوئی پوچھنے اور ٹوکنے والا نہ ہو بلکہ پوری ملت متحد ہو کر انہیں دادِ عیش دے۔ یہ ہیں حقیقت میں ان لوگوں کے عزائم اور یہ ہیں ان کے دلپسند خیالات۔ اسی بنا پر یہ لوگ ایک مگے بندھے منصوبے کے تحت وہ ساری چالیں چل رہے ہیں جن سے لوگ دین سے متنفر ہو جائیں اور اس طرح ان میں نہ تو اخلاقی حس باقی رہے اور نہ دینی حمیت۔ ساری کی ساری قوم بھیڑ بکریوں کا ایک ایسا گلہ بن جائے جسے یہ لوگ میکانکی طور پر جدھر چاہیں ہانک کر لے جائیں۔ چنانچہ دیکھیے اس مقصد کے حصول کے لیے کیا کیا تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں۔ یورپ کے پھیلائے ہوئے افکار و نظریات میں نہایت عیاری کے ساتھ ان چیزوں کو منتخب کیا جاتا ہے جن سے دینِ حق سے لوگوں کو منحرف کیا جا سکے۔ یہ تحریکِ ضبطِ ولادت بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ یورپ میں چونکہ اس تحریک کے پھیلنے سے اباحیتِ مطلقہ کا طوفان اٹھا، اسی وجہ سے اسے یہاں بھی پھیلانے کی کوشش ہو رہی ہے تاکہ عورت کو خاندانی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر کے اسے آزاد شہوت رانی کے لیے تیار کیا جائے ورنہ ذرائع و وسائل کا وہ سکون آفریں تصور جس کی آڑ میں اس برائی کو وہاں رواج دیا گیا تھا، اسے تو تاریخ نے خود ہی باطل ثابت کر دیا ہے۔